امریکہ کے متکبرانہ انداز

خارجہ پالیسی کی روشنی میں

ایڈورڈ سعید

ترجمہ: محمد ایوب منیر

عام انسانوں کی طرح' امریکی باشندے بھی زندگی کے روز مرہ مسائل' مثلاً ملازمت کی فکر' بچوں کے لیے تعلیمی اخراجات کی فراہمی اور ریٹائرمنٹ کے خدشات میں اس قدر غلطاں رہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں امریکہ کے غیر معمولی کردار کے بارے میں کچھ سوچنے یا غور کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ تاریخی لحاظ سے یہ براعظم' افریقہ' ایشیا حتیٰ کہ یورپ کے مسائل سے بڑی حد تک مختلف ہے' اور اس قدر وسیع اور میلوں سمندروں میں گھرا ہوا ہے کہ اکثر امریکی اس بات سے بہت کم براہ راست تعلق رکھتے ہیں جو بیرونی دنیا میں ان کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ اکثر واقعات سے وہ بے خبر ہوتے ہیں' اور جب وہ جانتے ہیں تو انھیں ایسے نظریاتی میڈیا کے اطلاعاتی نظام سے معلومات دی جاتی ہیں جن کا نظریہ (پالیسی) ایک مخلص' خیرخواہ اور سراپا خیر "امریکہ" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظم دراندازی' نسل کشی' آمریت کی غیر منصفانہ حمایت اور ایک منصوبے کے تحت دخل اندازی (مثلاً ۳۰ سال تک انڈونیشیا کے صدر سہارتو' اس کے خاندان اور اس کے زیر عاطفت لوگوں کی سرپرستی) جیسے مسائل کے بارے میں وہ کبھی سوال نہیں اٹھاپاتے۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں اخلاقی برتری کا احساس دیتا ہے' جہاں مخالفت کرنے والی چھوٹی ریاستیں اور فرانس اور چین جیسی حاسد طاقتیں پائی جاتی ہیں جو غلبہ اور برتری کے لیے نقب لگانے کو تیار بیٹھی ہیں۔ چنانچہ اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ فٹ بال کے موجودہ عالمی کپ کے موقع پر ایران کی امریکہ سے جیت پر خوشی کی ایک عالمی لہر دوڑ گئی۔ دوسروں پر اپنی مرضی مسلط کرنے' اپنی حیثیت دکھانے اور ظالمانہ

رویوں کی بنا پر امریکہ سے دنیا بھر میں اس قدر نفرت ہے کہ اس کے خلاف ایک بھرپور عالمی لہر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں کہ یورپی طاقتیں تک، برابری کی سطح پر امریکہ کے ساتھ پیچیدہ معاملات پر مذاکرات کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ عرب ریاستوں، بھارت و پاکستان، لاطینی امریکی ممالک، ایشیا اور افریقہ کے دیگر ممالک کی بات تو رہنے ہی دیجیے۔

مثال کے طور پر امریکہ کے مزاج کا یہ نمایاں پہلو کہ جن کو وہ ناپسند کرے یا جنھیں دہشت گرد، بدمعاش یا اچھوت (pariah) قرار دے دے، ان پر پابندیاں عائد کر دیتا ہے۔ آئے روز اس فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان بہت سے ممالک میں سوڈان، شام، ایران، عراق مسلمان ممالک ہیں، جب کہ دیگر ممالک جیسے بھارت اور پاکستان پر پابندیاں امریکہ نے سخت غصے اور برہمی کے عالم میں عائد کی ہیں کہ یہ کم تر، کم ترقی یافتہ اور ہمارے ("US") برابر نہیں ہیں۔

۱۹۹۱ سے عراق انتہائی ظالمانہ پابندیوں کا شکار ہے۔ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کسی ملک کو پابندیوں کی وجہ سے اس طرح سے تباہ کیا گیا ہو۔ ان پابندیوں نے واقعتاً لاکھوں معصوم انسانوں کو قتل کیا ہے۔ امریکہ کے شدید متکبرانہ رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے یہ پابندیاں ہمیشہ عائد رہیں گی۔ اس طرز عمل کی بنیاد تحفظ نہیں، اذیت دینا (sadism) ہے، جب کہ عراق کے قریبی ہمسائے جنھیں صدام کی خطرناک حکومت سے سب سے زیادہ خطرہ ہونا چاہیے بارہا کہہ چکے ہیں کہ صدام اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس کے باوجود امریکہ ہر ایک کے سامنے شاہانہ انداز سے اپنے اعتراضات دہراتا رہتا ہے، اخلاق سے گرے ہوئے اپنے اس کردار کو فراموش کرتے ہوئے جس نے ایک ملک کو اتنا نقصان پہنچایا ہے جتنا شاید ہی تاریخ میں کسی ملک نے دوسرے کو پہنچایا ہو۔

اس اثنا میں امریکہ، الجزائر کے حکمرانوں کی امداد جاری رکھتا ہے۔ خواہ آپ یہ سمجھیں کہ وہ امن و امان کی بحالی کے لیے کام کر رہے ہیں یا اپنے ظالمانہ اقتدار کے دوام کے لیے قتل عام کر رہے ہیں، تاہم یقینی طور پر وہ اپنے ہی شہریوں پر تشدد کے مجرم ہیں۔ چونکہ الجزائر کے پاس تیل ہے اور یہی وہ سبب ہے جو طاقتور امریکی کارپوریشنوں کی دل چسپی کا باعث ہے، اور وہی بڑے پیمانے پر الجزائر سے کاروبار کرتی ہیں، لہٰذا الجزائر ایک اچھوت (pariah) ریاست نہیں ہے۔

امریکہ نے جوہری تجربات کرنے پر برعظیم کے دو بڑے ممالک سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا ہے اور انھیں اپنی ناراضی اور اقتصادی پابندیوں کا نشانہ بنایا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ پچھلے ۵۵ برسوں میں کسی بھی عالمی طاقت کی بہ نسبت خود امریکہ نے جوہری دھماکے زیادہ کیے ہیں اور جاپان پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن آج تک نسل انسانی کے قتل عام کے اس قابل نفرین تاریخی

واقعے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکاری ہے۔

جب سمتھ سونین انسٹی ٹیوشن نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم باری کے متعلق ایک نمایش منعقد کرنا چاہی، جس میں اس جہاز Enola Gay کی تصویر بھی شامل تھی جس نے تاریخ کا واحد ایٹم بم گرایا تھا، تو اس پر کانگرس کے اندر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور "محب وطن" شہریوں کے کئی گروہوں نے سمتھ سونین کو مجبور کر دیا کہ اس مسئلے کو ختم کر دیں۔ اس نمایش کی تصویر کشی اس طرح سے کی گئی کہ گویا یہ امریکہ پر حملے سے کسی طور پر کم نہیں ہے۔ یہی بات مقبول ہے کہ "ہمارا ملک صحیح یا غلط"۔ اور اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ "امریکہ ہمیشہ حق پر ہوتا ہے"۔

یہ ایک رویہ ہے جو امریکہ کے ساتھ خاص ہے۔ اگرچہ بیشتر ریاستوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی تہذیب و تمدن اور ثقافتی ورثے کی خوبیاں اپنے شہریوں کو باور کرائیں اور انھیں ہر الزام سے مبرا قرار دیں۔ مگر اپنے وسیع رقبے اور غیر معمولی عالمی رسائی کے حوالے سے، ماضی کی کسی بھی سلطنت سے زیادہ، امریکہ نے برتری کے زعم میں واقعتاً اپنے آپ کو ساری دنیا کے ساتھ الجھا لیا ہے۔ ۱۹۵۴ میں گوئٹے مالا کی ۱۰ فی صد آبادی کو براہ راست امریکی سرپرستی میں ہلاک کیا گیا کیونکہ امریکہ کو اربنز (Arbenz) کی صدارت اس کے کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے تسلیم نہ تھی۔ کیوبا پر پچھلے ۴۰ سال سے پابندیاں عائد ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اس سے امریکہ کو خطرہ لاحق ہے--- وہ تو اقتصادی طور پر تباہ حال معمولی سا جزیرہ ہے جس کا وسیع و عریض امریکہ سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا--- وجہ صرف یہ ہے کہ سینیٹر Jesse Helms اور فلوریڈا سے اس کے دیگر ساتھی بار بار مطالبہ کرتے ہیں: "ہم چاہتے ہیں کہ کاسترو کو ہٹایا جائے"۔ گویا کیوبا یا اس حوالے سے دنیا کا کوئی دوسرا خطہ امریکہ کی رضامندی پر ہی اپنا وجود برقرار رکھنے کا حق رکھتا ہے۔

امریکہ کے متعلق ایک خاص بات عوام الناس کی سطح پر بھول جانے (amnesia) کے رویے کا پایا جانا ہے جسے اہل دانش نے بھی خاطر خواہ اہمیت نہیں دی ہے۔ بلکہ چند ایک کے سوا، اہل دانش کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ اس تصور کو درست سمجھتے ہیں کہ امریکہ ایک غیر معمولی ملک ہے اور ایک غیر معمولی کردار کی ادائیگی اس کے ذمے ہے۔ اس کی ماضی کی تمام غلط کاریاں، ماضی کی ایک یاد کی طرح دفن کر دی گئی ہیں۔ اگر انھیں کسی محقق یا تحقیقی گروہ کے ذریعے اجاگر کیا جائے تو ہر مرتبہ انھیں چھپا دیا جاتا ہے۔

کبھی کبھار جب دھوکا دہی، اعتراف جرم اور پچھتاوے کو کفارے کے طور پر ایک مذہبی رسم کی طرح ادا کیا جاتا ہے، تب بھی عوام الناس کی یادداشت اس کی رو میں بہہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر رابرٹ میکنامارا، جو ان منصوبہ سازوں میں سے ایک تھا جنھوں نے ویت نام کی تباہی و بربادی کی منصوبہ سازی کی تھی جس کی وجہ سے جنوب مشرقی ایشیا کے ۳۰ لاکھ کسان مار ڈالے گئے، ان کی زمینوں، شہروں اور گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد کر کے رکھ دیے گئے، اور اس غرض کے لیے امریکہ نے اپنے ساحلوں سے ۱۰ ہزار میل

کے فاصلے پر اعلیٰ ترین جنگی ٹکنالوجی استعمال کی محض اس لیے کہ امریکہ اپنی بالادستی کا لوہا منوا سکے۔ دو سال قبل اس شخص نے ایک کتاب لکھی اور بے انتہا کرب اور افسوس کے اظہار کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ اس نے غلطی کی تھی۔

''غلط'' کہہ دیا اور لیجیے بات ختم---! اس معمولی سے ''غلط'' نے لاکھوں امریکیوں بالخصوص ویت نامیوں کی زندگیوں کو عظیم تباہی سے دوچار کر دیا۔ ''غلط'' ایک ایسا لفظ ہے کہ جو انسان کے گلے میں اٹک کر رہ جاتا ہے، چاہے سارا معاملہ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو---! میکنامارا کو چاہیے کہ اپنے آپ کو جنگی مجرم کے طور پر پیش کرے۔ کتاب لکھنا ایک ایسا موقع تھا کہ وہ طویل دورانیے کے لیے ٹیلی وژن پر پیش ہوتا اور جس قدر غلط فیصلے اس نے کیے تھے اور جو جھوٹ اس نے بولے تھے، ان سب کا ندامت و شرم ساری کے ساتھ اعتراف کرتا۔ اس سے بھی بڑی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اس نے ''دیانت دارانہ خطا'' کی تھی، ایسی خطا کہ جو دو حکومتوں اور ۱۵ برسوں پر محیط تھی۔

میکنامارا کو اپنی غلطیوں کے اعتراف اور اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع فراہم کر دینا، اور کھلے عام اعتراف کی تقریبات کے اثرات اپنی جگہ، مگر اس سب کے باوجود امریکہ کے مجرمانہ رویے پر اعتراض کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ وہ مخلصانہ طور پر دنیا کو اشتراکیت وغیرہ کے غلبے سے بچانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔

جب معاملہ اسرائیل کا ہو (انڈونیشیا، لاؤس، کمبوڈیا، بوسنیا، چلی، ایران، گرینیڈا، پانامہ اور دوسرے مقامات کو چھوڑ دیجیے جہاں امریکہ بین الاقوامی دہشت گردی کو تسلیم کرتا ہے) تو مسلسل اس احساس کو پروان چڑھایا جاتا ہے کہ امریکہ تو حق، انصاف، امن اور اخلاق کا حامی و طرف دار ہے۔ اس تصور کے خلاف جو بھی بات ہو، اسے دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے، لیکن اگر اسرائیل یہ سب کچھ کرے تو اس پر کوئی الزام نہیں آتا۔ لبنان پر بم باری، فوجی قبضہ، علاقے کا جبری الحاق، اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو علاقے سے بے دخل کر دینا، اس کے تذکرے کی بھی ضرورت نہیں۔ امریکہ چیختا رہتا ہے کہ وہ اور اسی کی طرح کا اس کا بے قصور حلیف، اسرائیل امن اور انصاف کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ صرف امن اور انصاف کے لیے، اور کسی کے لیے نہیں۔ وہی امریکی روایتی خوب صورت ''امن و انصاف!''

مسئلہ یہ ہے کہ عرب ہونے کے ناطے، ہم اپنے اوپر ہونے والے مظالم کو طشت ازبام کر کے امریکہ کو اخلاقی اور تحریری طور پر ملوث کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے (غیر عربوں کا بھی یہی حال ہے)۔ عرصۂ دراز سے میں کہہ رہا ہوں کہ عالم عرب میں امریکہ کے متعلق قابل افسوس ناواقفیت پائی جاتی ہے--- ایسی غفلت جس کی وجہ سے ہم امریکہ کے نظام استحصال اور غیر سفید نسلوں کے خلاف اس کے منظم مظالم سے بھی آگاہ نہیں ہیں--- اس عدم واقفیت کے سبب ہم اس وہم کا شکار ہو چکے ہیں کہ امریکہ ہی واحد ثالث، آخری

عالمی طاقت اور ایسی طاقت ہے جو ہمارا حق دلانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

ہمارے مسائل کی جڑ عالم عرب کا افسوس ناک افتراق بھی ہے جہاں حکمران معمولی مفادات کو تو مدنظر رکھتے ہیں مگر انھیں اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہے کہ عرب ریاستیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف استعمال کی جاتی ہیں، ایک دوسرے پر بہتان باندھتی ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ ختم نہ ہونے والے جوڑ توڑ میں شریک رہتی ہیں۔ سرکاری سطح پر امریکہ کے نزدیک ہم صرف "عرب" ہیں، پگڑی پہننے والے بدوؤں کا گروہ جن میں فرق کرنا مشکل ہے، اور جو تشدد اور دیوانگی کے اسیر ہیں۔ ہم اپنے تہذیبی اور سائنسی پہلو کو ابھارنے کے بجائے امریکہ سے اسلحہ اور سامان ضرورت کی خریداری کے جذبات کو زیادہ ابھارنے میں لگے رہتے ہیں، اور اپنے آپ کو کبھی ختم نہ ہونے والی سربراہ کانفرنسوں، فلسطین کی نئی ریاست اور کسی انجانے دھماکے کے اندیشے جیسے مسائل کی بنا پر بڑی حد تک نااہل اور بے بس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم اپنے مسائل کو سنجیدگی سے لے ہی نہیں سکتے۔

امریکہ کا مقابلہ بلند بانگ نعروں اور امریکہ سے مزید جدید ہتھیاروں کی خریداری سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری اس سیکولر دنیا کی دیگر روایات کی طرح امریکہ کو بھی اپنی پالیسیوں، ناقابل قبول اور غیر قانونی حیثیت پر کھلی تنقید کا سامنا کرنا ہو گا۔ امن کی کوششوں کو جاری رکھنے کی درخواستیں، جو امریکہ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں، اب جب کہ نیتن یاہو اور امریکہ نے (جیسا کہ وہ چاہتے تھے) سارے معاملے کو مزید الجھا کر رکھ دیا ہے، اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک ناشائستہ اپیل، اپنی ذلت، اور ضعف کا اعلان۔

آخر عرب ممالک اپنا منصوبۂ امن اپنی فہم و فراست کی روشنی میں کیوں وضع نہیں کرتے جس سے دنیا کے دوسرے ممالک بھی اتفاق کریں اور دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ امریکہ کی کوئی جعل سازی اور کوئی ظلم ہمیں ہمارے عزم سے نہیں ہٹا سکتا!

میرے خیال میں اس قسم کے عزم کے لیے سوچنا اسی طرح ہے جس طرح عرب لیڈروں کا پالیسی سازوں اور ماہرین کے ساتھ انتظار کرنا کہ جنھیں آہستہ آہستہ دھکیل کر لایا جا رہا ہو۔ اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس وقت جو چیز ہمیں درکار ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی تمام پالیسیوں پر نظرثانی کریں، اسی طرح امریکہ کے ساتھ تعلقات بھی۔ اور ہنری کسنجر جیسے بڑے پالیسی سازوں کی آرا کا شدید محاسبہ کریں، جن کی رائے پر امریکی حکومت عمل درآمد کرتی ہے، اور جس کا یہ خیال ہے کہ ہر عرب مجھ سے ملنا اور میرے ساتھ ناشتہ کرنا پسند کرتا ہے۔ جیسا کہ یہ کہنا ایک کہاوت کی طرح ہو گیا ہے: "یہ بات مجھ سے گذشتہ روز ہنری کسنجر نے کافی پیتے ہوئے کہی"۔